https://telegram.me/ilmokitab

سلیم احمد

سلیم احمد سے میرا تعلق اور رشتہ کچھ اور طرح کا ہے۔ میں حلقۂ نیاز مندان سلیم احمد کا رکن نہیں تھا' میری ان کے ساتھ ادب' شاعری' مذہب' سیاست اور فلسفہ کے موضوعات پر بحثیں بھی نہیں ہوتی تھیں۔ میں لکھنے والوں کے اس قبیلہ سے بھی تعلق نہیں رکھتا تھا' جو اپنی نثری یا شعری تخلیقات بغرض اصلاح سلیم احمد کی خدمت میں پیش کرتے تھے۔ میں کسی ادبی انجمن یا ادبی گروہ کا ممبر بھی نہیں تھا کہ ادبی معرکوں میں سلیم احمد کے طرف داروں یا ان کے مخالفین میں شمار ہوتا ہوں۔ میں سلیم احمد سے دوستی کا دعویدار بھی نہیں تھا۔ چونکہ وہ عمر میں مجھ سے بڑے تھے اور میرٹھ میں میرے بڑے بھائی کے کلاس فیلو رہ چکے تھے' اسی لیے میں نے کہا کہ سلیم احمد سے میرا تعلق اور رشتہ کچھ اور طرح کا تھا۔ ہماری جان پہچان' شناسائی' قربت اور محبت کم و بیش پچیس' چھبیس برسوں پر محیط ہے۔ ان کے شاگردوں' دوستوں' دفتری ساتھیوں اور نیاز مندوں کی طرح میں نے کبھی انہیں سلیم بھائی کہہ کر نہیں پکارا' حالانکہ وہ جگت سلیم بھائی تھے۔ میں نے انہیں ہمیشہ سلیم احمد یا سلیم کہہ کر ہی مخاطب کیا۔ ریڈیو پاکستان کی ملازمت اختیار کرنے سے پہلے میں ان سے بالکل واقف نہیں تھا۔ میری اور ان کی پہلی ملاقات 1955ء میں ہوئی' جب میں ریڈیو پاکستان کراچی میں پروگرام پروڈیوسر کی حیثیت سے ملازم ہوا۔ یہ بات میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ پہلی ہی ملاقات میں' میں نے ان کو اور انہوں نے مجھے پسند کیا اور پھر رفتہ رفتہ یہ پسندیدگی ایک اپنائیت اور پھر محبت میں تبدیل ہو گئی' مگر ان کی محبت میں شفقت کا پہلو بھی تھا۔ اگر میں کہوں کہ انہوں نے ہمیشہ مجھے شمیم احمد کی طرح اپنا چھوٹا بھائی تصور کیا تو شاید غلط نہ ہو گا۔ ویسے ہمارا دفتری رشتہ اس طرح کا رہا کہ ڈراما سیکشن کا انچارج ہونے کے حوالے سے میں ان

کا افسر تھا۔ ان کی حاضری کا رجسٹر' ان کی چھٹی کی درخواست' ان کی سالانہ کارکردگی کی رپورٹس' میری ذمہ داریوں میں شامل تھیں۔ لیکن ہمارے تعلقات اس طرح کے رہے کہ جب وہ آتے میں احتراماً کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو جاتا۔ اگر دو دو' تین تین روز وہ دفتر کا پھیرا نہ لگاتے تو میں کبھی ان سے غیر حاضری کی جواب طلبی نہ کرتا' وہ اگر کبھی مجھ سے کسی کام کے لیے کہتے تو میرے نزدیک ان کے کہے کی اہمیت ریڈیو کے بڑے سے بڑے افسر کے حکم سے زیادہ ہوتی۔ محبت' انسیت اور عقیدت کے علاوہ ان کی شخصیت کا ایک خاص قسم کا رعب بھی مجھ پر طاری رہتا تھا اور یہ رعب صرف مجھ پر ہی نہیں تھا' ان کے اردگرد کے سارے لوگ ان سے مرعوب تھے۔ خواہ بڑے بڑے ادیب اور شاعر ہوں' ان کے پرانے اور نئے احباب ہوں' محکمہ کے افسران کرام ہوں۔ وہ کوئی بہت لحیم شحیم' بلند قامت' پرشکوہ قسم کے آدمی نہیں تھے کہ ان کے سامنے جا کر انسان احساس کمتری کا شکار ہو جائے' وہ کسی بڑے عہدے پر فائز نہیں تھے' کوئی رئیس اور مال دار شخص بھی نہیں تھے' حسن و جمال کا مرقع بھی نہیں تھے کہ ان کے سامنے دوسروں کی شخصیت ماند پڑ جائے' یہ صرف اور صرف ان کی علمیت اور تخلیقی صلاحیتوں کا رعب تھا۔

لوگ سلیم احمد کے علم و فضل کے معترف تھے۔ ویسے دیکھا جائے تو سلیم احمد کی رسمی تعلیم کچھ بہت زیادہ نہیں تھی۔ وہ تقسیم ہند کے وقت میرٹھ میں اپنی کالج کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر پاکستان آ گئے تھے' مگر دانشوری اور علمیت کالج اور یونیورسٹی کی ڈگریوں کی محتاج نہیں ہوتی۔ بلاشبہ سلیم احمد جتنے پڑھے لکھے آدمی تھے' اتنے پڑھے لکھے لوگ اس دور میں کم ہی ملیں گے۔ ان کے رعب علم کا ذکر چل نکلا ہے تو اپنے اور ان کے تعلقات کے موضوع کی جانب پلٹنے سے قبل اردو کے نامور محقق اور نقاد فتح محمد ملک کے ایک مضمون سے چھوٹا سا اقتباس پیش کرتا چلوں' جس سے اوپر بیان کیے گئے میرے بیان کی وضاحت ہو جائے گی۔ فتح محمد ملک نے لکھا ہے کہ: "اسلام آباد ہوٹل کے ایک کمرے میں احمد ندیم قاسمی کے پاس ادیبوں کا ہجوم لگا تھا۔ جائے تنگ و مردماں بسیار کی صورت درپیش تھی۔ لوگ آتے اور جہاں جگہ پاتے ٹک جاتے' سلیم احمد تشریف لائے تو میں نے بمشکل انہیں اپنی کرسی پر بٹھایا اور خود ایک کونے میں کھڑا ہو گیا۔ سلیم احمد کے رخصت ہونے پر' پریشان خٹک میرے اس طرز عمل پر معترض ہوئے' کہنے لگے "میں ایک یونیورسٹی کا وائس چانسلر ہوں' صدیق سالک

صدر مملکت کے پریس سیکرٹری ہیں' ہم دونوں خوبصورت' لمبے تڑنگے جوان ہیں' ہم نے تھری پیس سوٹ پہن رکھے ہیں' جب ہم داخل ہوئے تو ملک صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے' لیکن جب میلی سی شیروانی میں ملبوس ایک شخص آیا تو انہوں نے بصد اصرار اسے اپنی کرسی پیش کردی۔ میں اور سالک پلنگ کی پائنتی پر سکڑتے رہے۔ میں اپنی اور سالک کی طرف سے اس رویہ پر احتجاج کرتا ہوں۔" اس پر احمد ندیم قاسمی نے حیرت کے ساتھ پوچھا "پریشان صاحب! آپ واقعی اس اجلی اور منور شخصیت سے متعارف نہیں' یہ سلیم احمد تھے۔" "اچھا تب ہی آپ بھی ہم سب کو بھول کر صرف انہی کے ساتھ باتوں میں محو ہوگئے۔" پریشان خٹک کی تشفی ہوگئی۔ یہ تھا سلیم احمد کی شخصیت کا سحر اور ان کی علمیت کا رعب۔

میرا سلیم احمد کا جو رشتہ تھا اس کے دو پہلو تھے۔ ایک پیشہ ورانہ اور دوسرا ذاتی۔ مجھے ڈرامے سے دیوانگی کی حد تک عشق تھا اور صرف یہ ڈرامے کی محبت ہی تھی' جس کی بنا پر میں نے سی ایس پی افسر بننے پر پروگرام پروڈیوسر ہونے کو ترجیح دی۔ خوش قسمتی سے ریڈیو کی دنیا میں مجھے ایسے لائق' فائق اور خوبصورت دل و دماغ رکھنے والے لوگ ملے کہ اپنے فیصلہ پر مجھے ساری زندگی کوئی پچھتاوا نہیں ہوا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے جو نام اور شہرت بہت ہی کم عمری میں اپنی ملازمت کے ابتدائی تین چار برسوں میں مل گئی' وہ میرے کالج کے دوسرے ساتھیوں کو اپنے کیریئر کے اختتام تک حاصل نہ ہو سکی۔ ریڈیو پاکستان کا ایک پروڈیوسر ہونے کی حیثیت سے میری جان پہچان میل ملاقات اس دور کی عظیم ادبی' سماجی' دینی' سیاسی اور سرکاری شخصیتوں سے ایسی تھی' جس کے لیے بڑے بڑے امیر کبیر اور حکومت کے اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز افسران ترستے تھے' چونکہ ڈرامے کے شعبے کے علاوہ میں آؤٹ سائیڈ براڈکاسٹ کے پروگرام بھی پروڈیوس کرتا تھا' لہٰذا سارے سربراہان حکومت' وزیر' سفیر اور اعلیٰ عہدیدار سب سے واقفیت تھی اور ان میں سے اکثر مجھے میرا نام لے کر پکارتے تھے۔

سوچتا ہوں تو اللہ تعالیٰ کے اس فضل سے آنکھیں بھر آتی ہیں کہ اس نے زندگی میں کس قدر عزت اور بے پناہ شہرت عطا کی۔ اگرچہ مالی نقطۂ نظر سے میری ملازمت اور پیشہ کسی صورت بھی منافع بخش نہیں تھا' مگر جب کسی بازار میں' کسی میلہ میں' کسی یونیورسٹی یا کالج میں' کسی استقبالیہ اور شادی کی تقریب میں' دنیا کے کسی ملک کے ایئرپورٹ پر کسی کو سرگوشیوں میں' کسی کو بلند آواز میں اپنا نام لیتے سنتا ہوں تو وہ ساری مالی مشکلات جو اس

ملازمت کے دوران پیش آتی رہیں، بالکل حقیر اور بے معنی نظر آتی ہیں۔ زندگی کی یہ اتنی بڑی دولت صرف اپنے پیشہ سے محبت اور انتھک محنت اور لگن کے ساتھ کام کرنے کے سبب میسر آئی۔ ڈرامے سے والہانہ محبت ہی تھی، جس نے سلیم احمد کے ساتھ پیشہ ورانہ رشتے کو مستحکم کیا۔ میں نے ریڈیو پاکستان کراچی سے وابستگی کے زمانے میں سلیم احمد کے لکھے ہوئے ان گنت پروگرام پروڈیوس کیے، جن میں فیچر، غنایئے، تمثیلچے اور خاکے شامل تھے، لیکن میرا ان کا ساتھ، جس نے اس دور میں ہم دونوں کی شہرت اور مقبولیت کو بام عروج پر پہنچایا، وہ سٹوڈیو نمبر 9 میں نشر ہونے والے ڈرامے تھے۔

سٹوڈیو نمبر 9 ایک ہفتہ وار پروگرام کا عنوان تھا، جس میں ہر اتوار کی رات نو بجے ایک گھنٹے کا اردو ڈرامہ پیش کیا جاتا تھا۔ ڈراموں کا یہ سلسلہ ریڈیو کے ایک بہت ہی باصلاحیت اور قابل پروڈیوسر شمس الدین بٹ نے شروع کیا تھا۔ 55-1954ء میں شمس الدین بٹ امریکہ سے براڈکاسٹنگ کے مضمون میں ایم اے کی ڈگری لے کر آئے تھے، وہ برصغیر کے پہلے براڈکاسٹر تھے، جس نے یہ ڈگری حاصل کی تھی۔ میں نے جب ریڈیو کی ملازمت شروع کی تو بٹ صاحب ان دنوں ڈرامہ سیکشن کے انچارج تھے اور میرا خیال ہے کہ میری سب سے بڑی خوش نصیبی یہ ہوئی کہ مجھے انہی کے سیکشن میں لگایا گیا۔ اس طرح میں انہیں اپنا استاد سمجھتا ہوں۔ میں نے ریڈیو پروڈکشن میں تکنیک کے حوالے سے بہت کچھ انہی سے سیکھا۔
ڈرامہ سیکشن ریڈیو اسٹیشن کا اہم ترین شعبہ سمجھا جاتا تھا۔ دراصل تفریحی پروگراموں کا سارا دارومدار موسیقی اور ڈرامے کے شعبوں پر ہوتا تھا، اسی لیے بہترین تخلیقی ذہن رکھنے والے اور زیادہ باصلاحیت پروڈیوسروں اور پروگرام لکھنے والوں اور پیش کرنے والوں کو ان دو شعبوں میں بھیجنے پر ترجیح دی جاتی تھی۔ کراچی ریڈیو کے ڈرامہ اور فیچر پروگراموں کے شعبے میں پروگرام پروڈیوسروں کے علاوہ اور بہت سے لوگ بھی تھے، جن کو سٹاف آرٹسٹ کہا جاتا تھا، یہ پکے ملازم نہیں ہوتے تھے۔ ہر سال ان کے کنٹریکٹ کی تجدید کی جاتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اگر سال میں کسی کی کارکردگی مقررہ معیار سے نیچی رہی ہو تو اس کے کنٹریکٹ کی تجدید نہ کی جائے، یہ بڑی تکلیف دہ بات تھی۔ یعنی ملازمت کے ہوتے ہوئے بھی سر پر تلوار لٹکتی رہتی تھی کہ خدا جانے سال کے بعد افسران بالا ملازمت کو برقرار رکھنے کا فیصلہ کرتے ہیں یا نہیں۔ یہ طریقہ کار انگریز کے زمانے سے رائج تھا، جو خدا خدا کرکے 1973ء میں ختم

ہوا کہ جب ریڈیو پاکستان کو سرکاری محکمہ کے بجائے ایک خود مختار کارپوریشن کا درجہ حاصل ہوا اور سارے سٹاف آرٹسٹ' جن میں میوزک کمپوزر' شاعر' سکرپٹ رائٹر' صداکار' گلوکار' سازندے' اناؤنسر اور نیوز ریڈرز وغیرہ شامل تھے' مستقل ملازمت کے حقدار گردانے گئے۔

جن دنوں کی میں بات کر رہا ہوں یعنی جب ریڈیو پاکستان کراچی کے ڈرامہ سیکشن میں بحثیت پروڈیوسر میرا تقرر ہوا۔ ان دنوں ڈرامہ سیکشن میں جو سٹاف آرٹسٹ متعین تھے ان میں صداکاروں میں ایس ایم سلیم' عبدالماجد' محمود علی' امیر خان' ریحان غزنولی' ظفر صدیقی' عرش منیر' فاطمہ خانم' اختری بیگم' صفیہ معینی اور آغا حشر کے تھیٹر کے مشہور فن کار عبدالرحمن کابلی اور مغل بشر وغیرہ شامل تھے۔ سکرپٹ رائٹرز میں مولانا ارشد تھانوی' شعیب حزیں' انتصار حسین اور سلیم احمد کے نام قابل ذکر ہیں کہ جو ہمہ وقت' سلسلہ وار پروگرام' فیچر' خاکے اور ڈرامے لکھنے میں مصروف رہتے تھے۔ ریڈیو کے لیے لکھنے والوں میں اور صلاحیتوں کے علاوہ "زود نویسی" ایک لازمی وصف سمجھا جاتا ہے۔ اچھا لکھنا وقت کے دورانیے کے مطابق لکھنا اور جلدی لکھنا ایک ریڈیو سکرپٹ رائٹر کی کامیابی کے لیے بے حد ضروری ہے۔ سلیم احمد میں یہ تینوں خصوصیات موجود تھیں۔ میں نے ان کو ایک گھنٹے کا سکرپٹ ایک گھنٹے میں مکمل کرتے دیکھا ہے' کبھی کبھی تو یہاں تک ہوا کہ کسی خاص موضوع پر ایمر جنسی میں لکھنا پڑ گیا تو سلیم احمد نیچے دفتر کی میز پر بیٹھے ایک ایک صفحہ لکھتے جا رہے ہیں اور ہم اوپر سٹوڈیو میں اس فیچر کی لائیو براڈ کاسٹ کرنے میں مشغول ہیں۔ اس طرح کہ نئے لکھے ہوئے صفحات نیچے سے آتے رہے اور پروگرام نشر ہوتا رہا' لیکن اس طرح سکرپٹ لکھنا فیچروں اور پروپیگنڈا پروگراموں کی حد تک تو ممکن تھا' مگر ڈرامہ لکھنے کے لیے سلیم احمد کو سکون اور لمبے وقت کی ضرورت ہوتی تھی۔ اور یہ کام وہ گھر پر ہی کرتے تھے۔ جب میں نے سٹوڈیو نمبر 9 کے لیے ڈرامے پروڈیوس کرنا شروع کیے تو سلیم اور میرے پیشہ ورانہ رشتے کا آغاز ہوا۔ انہیں میرے پروڈیوس کیے ہوئے کھیل پسند آئے اور ڈرامے کے ساتھ میری رغبت کو انہوں نے بے حد سراہا۔ آخر آخر تو یہ ہوا کہ وہ سٹوڈیو نمبر 9 کے لیے ڈرامہ لکھتے ہی اس شرط پر تھے کہ میں اسے پروڈیوس کروں۔ اس طرح میرا خیال ہے چند ہی برسوں میں' میں نے سلیم احمد کے کم از کم پچیس' تیس ڈرامے پروڈیوس کر دیئے ہوں گے۔ ان میں طبع زاد ڈراموں کے علاوہ عالمی شہرت یافتہ مصنفوں سوفوکلیز' یوری پی ڈیز ابسن' آسکر وائلڈ'

سارتر' پراندلو' برنارڈشا' یوجین اونیل اور دوسرے امریکی اور یورپی جدید ڈرامہ نگاروں کے کھیلوں سے ماخوذ ڈرامے بھی شامل تھے۔ تاریخ سلیم احمد کا پسندیدہ مضمون تھا اور میں خود بھی تاریخ کا طالب علم تھا' لہٰذا سب سے زیادہ لطف ہم دونوں کو تاریخی ڈراموں کی تحریر و پیشکش میں آتا تھا۔ اس ضمن میں چنگیز خان' تیمور' 1857ء' جھوٹا دیوتا' صلاح الدین ایوبی' البرامکہ جیسے معرکتہ الآرا ڈرامے انہوں نے لکھے۔ ان کے دیگر ڈراموں میں چند ایک کے نام مجھے اب بھی یاد ہیں' جن میں موسم اور محبت' شاہراہ حیات' خودکشی' یہ کس کی لاش ہے' ایسا کچھ کر کے چلو' کفارہ' چکر اور نغمانہ وغیرہ کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔

ہمارا پیشہ ورانہ رشتہ وقت کے ساتھ مستحکم سے مستحکم تر ہوتا گیا اور چونکہ ان سے ڈرامہ لکھانے کے لیے مجھے بار بار ان کے گھر جانا پڑتا تھا تاکہ ہر مرحلہ پر سکرپٹ دیکھتا رہوں' اپنی رائے دیتا رہوں اور اگر ضروری ہو وہ مجھ سے گفتگو کے بعد ترمیم بھی کرتے رہیں۔ اس مستقل آنے جانے نے ان سے ذاتی تعلقات کی بنیاد ڈالی۔ ان کا گھر مجھے اپنا گھر معلوم ہونے لگا۔ ان کے بھائی شمیم احمد' ان کے کزن افضال احمد' ان کی بہن زاہدہ اور ان کی والدہ جنہیں ان کے ساتھ میں بھی آپا کہا کرتا تھا' مجھے اپنے گھر کے افراد معلوم ہونے لگے۔ ایک رشتہ یہ بھی نکل آیا کہ میری پیدائش میرٹھ کی تھی اور سلیم احمد کا تعلق بھی یوپی کے اسی مشہور شہر سے تھا۔ ویسے پیدا تو وہ ضلع بارہ بنکی کے کھیولی نامہ قصبہ میں ہوئے تھے' لیکن ابتدائی تعلیم کھیولی اور اس کے بعد لکھنو میں حاصل کر کے وہ 1943ء میں میرٹھ آگئے تھے' جہاں انہوں نے فیض عام انٹر کالج میں داخلہ لے کر میٹرک کیا اور اس کے بعد ایف اے کے لیے میرٹھ کالج میں آگئے' مگر بی اے کی ڈگری حاصل کرنے سے قبل ہی میرٹھ چھوڑ کر کراچی آنا پڑا۔

سلیم احمد نے اپنے ادبی سفر کا آغاز میرٹھ سے کیا اور اسی شہر میں انہیں ایسے ادیبوں اور دانشوروں کا ساتھ نصیب ہوا' جو تاحیات ان کے قریبی حلقہ احباب میں شامل رہے۔ محمد حسن عسکری' پروفیسر کرار حسین' ڈاکٹر جمیل جالبی اور انتظار حسین جیسے نامور لکھنے والے' سب سلیم احمد کے میرٹھ کے ساتھیوں میں سے ہیں۔ جمیل جالبی' جنہوں نے سلیم احمد کو بالکل ابتدائی دور میں دیکھا' لکھتے ہیں "میرٹھ میں میری اور سلیم احمد کی ملاقات ہوئی۔ ہم دونوں فرسٹ ایئر کے طالب علم تھے اور ادب کی دنیا میں کچھ کر گزرنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔

دن رات یہی اوڑھنا بچھونا تھا۔ یہی موضوعِ سخن تھا اور یہی مقصدِ زندگی تھا۔ ہم دونوں نئی نئی کتابیں پڑھتے، تبادلۂ خیال کرتے اور گھنٹوں انہی مسائل میں گم رہتے تھے۔ وہ اقبال کے رنگ میں شعر کہتے تھے۔ مجھے یاد ہے، اپنی زندگی کے اس زمانے میں سلیم احمد اور میں روز ایک افسانہ لکھتے تھے۔ کبھی کرشن چندر کے رنگ میں، کبھی عصمت چغتائی اور منٹو کے رنگ میں اور کبھی ناصر علی دہلوی کے رنگ میں ادبِ لطیف تخلیق کرتے۔ دو تین سال کے عرصے میں ہم نے سینکڑوں افسانے لکھے اور بے شمار کتابیں پڑھیں، اس کاوش سے لکھنے کی مشق ہو گئی اور ادب کا ذوق سنور گیا۔"

لکھنے کی اس مشق نے، جس کا ذکر جالبی صاحب نے کیا، زندگی میں سلیم احمد کو بڑا فائدہ پہنچایا۔ 1950ء میں انہوں نے ریڈیو پاکستان کراچی میں بحیثیت سکرپٹ رائٹر ملازمت اختیار کی۔ جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے۔ ریڈیو کے سٹاف سکرپٹ رائٹر میں دیگر صلاحیتوں کے علاوہ دنیا کے ہر موضوع پر تیز رفتاری سے لکھنے کی صلاحیت بہت ضروری ہے، خاص طور پر سرکاری ریڈیو میں تو پروگراموں کی ترتیب و پیشکش کا دارومدار ہی اس پر ہے، پروگراموں کے موضوعات اور ان موضوعات پر حکمتِ عملی کے فیصلے کہیں اور ہوتے ہیں۔ پروگرام لکھنے اور پیش کرنے والوں کو تو صرف یہ بتایا جاتا ہے کہ فلاں موضوع پر ایک تقریر، فیچر یا تمثیلچہ لکھنا ہے اور فلاں تاریخ اور فلاں وقت نشر کرنا ہے۔ اب یہ ساری ذمہ داری پروگرام بنانے والوں کی ہے کہ وہ اس موضوع کو حکومت کی پالیسی کے مطابق کس رنگ اور کس ڈھنگ میں ریڈیو پروگرام کے سانچے میں ڈھالتے ہیں، سلیم احمد اس فن کے بڑے ماہر تھے۔

وہ بلا کے زود نویس تھے اور ساتھ ہی زبان و بیان کے سلسلہ میں کم سے کم معیار سے نیچے نہیں اترتے تھے۔ اپنے طویل عرصہ ملازمت میں انہوں نے ہزارہا سکرپٹ لکھے ہوں گے اور لاکھوں کروڑوں لفظ، جو انہوں نے لکھے ریڈیو سے نشر ہونے کے بعد فضا میں تحلیل ہوتے رہے، لیکن میرا چھ سات برس کے ساتھ کا تجربہ یہ ہے کہ ان کی ایسی تحریروں میں بھی، جنہیں مغرب میں Hack Writing کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ سلیم احمد کا مخصوص اسلوب اور طرزِ بیان انہیں دوسرے لکھنے والوں سے ممتاز کرتا ہے، خاص طور پر ڈرامے کو انہوں نے کبھی ان سرکاری قسم کے پروگراموں میں شامل نہیں سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ریڈیو اور بعد ازاں ٹیلی ویژن کے لیے جتنے کھیل یا ڈرامہ سیریز لکھیں، ان سب کا

اردو ادب میں ایک مقام ہے۔ اس کام میں وہ پالیسی یا وقت کی پابندی کرنے کے قائل نہیں تھے۔ مجھے یاد ہے' میں نے ٹیلی ویژن کے لیے ان سے "تعبیر" کے نام سے ایک ڈرامہ سیریل لکھوایا' جو تحریک آزادی اور جدوجہد پاکستان کے موضوع پر تھا۔

میں چاہتا تھا کہ جلد از جلد یہ سیریل ٹیلی ویژن پر پیش کیا جائے' چونکہ مجھ پر سرکاری حلقوں کی طرف سے شدید دباؤ تھا' میں کراچی جا کر ان سے ملا اور انہیں یہ سلسلہ وار ڈرامہ لکھنے پر راضی کیا اور جلد مکمل کرنے کا مطالبہ کیا۔ سلیم احمد نے مجھ سے تو کچھ نہیں کہا' مگر افتخار عارف کے ذریعے' جو ان دنوں کراچی ٹیلی ویژن کے سکرپٹ ایڈیٹر تھے' بعد میں مجھے پیغام بجھوادیا کہ "آغا خان کو کہہ دو' یہ کام میں اپنی مرضی سے کروں گا اور اتنا وقت لوں گا' جس قدر درکار ہے۔" ساتھ ہی انہوں نے سیاست' معاشیات اور تاریخ کی بہت سے کتابوں کی فہرست بھی پیش کی' جن کا مطالعہ ڈرامہ سیریل کی تصنیف و تہذیب کے لیے ضروری تھا۔ میں نے افتخار عارف سے مشورہ کرنے کے بعد سلیم احمد کی بات تسلیم کر لی اور جب انہوں نے اپنی مرضی کے مطابق تحقیقی کتب کے مطالعہ کے بعد "تعبیر" کے سکرپٹ لکھے اور اس دور کے ہونہار پروڈیوسر محسن علی نے پیش کیے تو ہر طرف دھوم مچ گئی۔ سلیم احمد نے ٹیلی ویژن کے لیے چند ایک اور ڈرامے اور سلسلہ وار ڈرامائی پروگرام بھی لکھے' جن میں نسیم حجازی کے ناول "آخری چٹان" اور "شاہین" بھی شامل ہیں۔ یہ سارے سلسلہ وار پروگرام بے حد مقبول ہوئے اور اس طرح سلیم احمد شاعر' نقاد اور محقق کے علاوہ ملک کے ایک بڑے ڈرامہ نگار بھی تسلیم کیے جانے لگے۔

سلیم احمد کی شخصیت میں ایک عجیب سا رچاؤ تھا' ان کے چہرے میں ایک خاص قسم کی جاذبیت تھی۔ ان کی آنکھوں میں ذہانت' نجابت اور شرارت کی ملی جلی چمک ہوتی اور انداز گفتگو میں بے پناہ دل ربائی ہوتی تھی۔ وہ ایک بے حد من موہنی شخصیت تھے۔ ان کا چہرہ ہمیشہ کھلا رہتا اور ایک دائمی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں سے ہمیشہ پیوستہ رہتی' وضع قطع اور لباس کے اعتبار سے سلیم احمد سادگی اور لاپروائی کا نمونہ تھے۔ کرتا پاجامہ اور شیروانی کے علاوہ میں نے کبھی انہیں کسی اور لباس میں نہیں دیکھا' لیکن اس سادگی کے باوجود ہر ملنے والے کو ایک غیر معمولی کشش اور جاذبیت کا احساس ہوتا تھا۔

سلیم احمد کا سراپا بیان کرنا میرے بس کا کام نہیں۔ یہ کام تو میرا دوست ریاض فرشوری

بھی نہیں کرسکا، جس نے سلیم کے پہلے شعری مجموعہ "بیاض" کے دیباچہ میں یوں لکھا تھا:

"اس جنگل میں آپ سلیم احمد کو کہاں تلاش کریں گے، سلیم احمد جو ایک بڑا غزل گو شاعر ہے، جو بہت اچھا ڈرامہ نگار ہے، جو تنقید میں اصولی معاملات پر امام غزالیؒ کی طرح ہنٹر کھینچے بیٹھا رہتا ہے، جو ایک بڑے خاندان کا تنہا کفیل ہے، جس نے دوستوں سے ایذا اٹھانے کے بعد بھی انہیں دعائیں دی ہیں، جو نروان کی تلاش میں جس درخت کے نیچے جاکر بیٹھا اس کی تپش سے درخت ہی جل اٹھا، بہت مجبور ہو کر اب وہ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کے پاس جا بیٹھا ہے، جہاں نہ کوئی صحرا ہے، نہ کوئی درخت، ہر طرف آگ ہی آگ ہے۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے میں نے اسے مشورہ دیا کہ "بیاض" کے ساتھ تصویر شائع نہ کراؤ، کیونکہ تمہاری ہر تصویر جھوٹی ہوگی۔ اس نے کہا "لفظوں میں تو سما سکتی ہے۔" میں نے سوچا تیس بتیس سال کا تیکھے خطوط کا شیروانی پہنے، ہنستا ہنساتا، اچھا خاصا معتدل آدمی ہے۔ لفظوں میں تصویر آ تو سکتی ہے، لیکن اب جب یہ تصویر کھینچے بیٹھا ہوں تو خیال آرہا ہے کہ جس طرح خوشبو کو، روشنی کی کیفیت کو، ابلتے ہوئے سمندروں کی جھلاہٹ کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح سلیم احمد کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔"

میں تقریباً سات سال ریڈیو پاکستان کراچی کے ڈرامہ سیکشن کا انچارج رہا۔ جب ریڈیو میں میرا تقرر ہوا، ان دنوں شمس الدین بٹ ڈرامہ کے انچارج تھے۔ ریڈیو پاکستان کے ایک بہت بڑے کنبے میں ڈرامہ سیکشن ایک چھوٹے سے خوشحال خاندان کی طرح تھا۔ بٹ صاحب کبھی کبھی اپنے سیکشن سے منسلک پروڈیوسرز، سٹاف آرٹسٹ اور باہر سے بک کیے جانے والے صداکاروں سے ایک ایک روپیہ جمع کرتے اور کھارادر میں ایک ہندو حلوائی کی دکان پر سب کو لے کر جاتے، جہاں کراچی کی لذیذ ترین حلوہ پوری اور مٹھائی دستیاب تھی۔ اسی طرح جب شہر کے کسی سینما گھر میں کوئی اچھی انگریزی فلم لگتی، وہ ٹکٹ کے پیسے جمع کرتے اور کسی ایک شو میں ساری پارٹی فلم دیکھنے پہنچ جاتی۔ سلیم احمد بھی اسی خاندان کے رکن تھے، اور اس طرح کی آؤٹنگ میں کبھی کبھی وہ بھی حصہ لیتے تھے۔ مگر ان کے شوق کھانے پینے کی حد تک مختلف تھے۔ مثلاً ان کو بھنے ہوئے چنے، نمک، مرچ کے ساتھ کھانے میں جس قدر مزہ آتا تھا، وہ ناقابل بیان ہے۔ چنوں کے آگے وہ دنیا کی لذیذ سے لذیذ نعمت چھوڑنے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ اس کے علاوہ انہیں سگریٹ اور چائے کا بھی بے حد

شوق تھا۔ ان کا روز کا یہ معمول تھا کہ دوپہر کے بعد دفتر آتے' سیدھے میرے کمرے کا رخ کرتے' کچھ دیر میرے پاس بیٹھتے' اگلے چند دنوں کے کاموں کا پتا کرتے' چائے پیتے اور جتنے لوگ بھی اس وقت کمرے میں موجود ہوتے' ان سب کو چائے پلاتے اور اس کے بعد ریڈیو کے دوسرے افسروں اور دوستوں کے ساتھ کچھ وقت گزارتے اور واپس چلے جاتے۔ سلیم احمد ہمیشہ ایک جلوس کی صورت میں ریڈیو سٹیشن کے گیٹ میں داخل ہوتے' اس طرح کہ ان کے دائیں بائیں ان کے پرستاروں' شاگردوں اور دوستوں کا ایک گروہ ہوتا۔ اس گروہ کے مستقل ممبران میں اطہر نفیس' جمال پانی پتی' شمیم احمد' عزیز ہاشمی' افضال احمد' صہبا اختر' ساقی فاروقی اور کبھی کبھی قمر جمیل' احمد ہمیش' نگار صہبائی' عبیداللہ علیم' جمال احسانی اور عالم تاب تشنہ وغیرہ بھی ہوتے۔ میرے دفتر کے علاوہ جہاں ان کو اپنی آمد کی رپورٹ کرنا ضروری ہوتی تھی' جن اور لوگوں کے کمروں میں وہ جا کر گپ شپ کرتے' ان میں محمد عمر مہاجر' احمد ہمدانی' حمید نسیم' ریاض فرشوری' قمر جمیل' حمید زمان اور عزیز حامد مدنی شامل تھے۔ وہ جس کمرے میں بھی ہوتے دور ہی سے ان کی موجودگی کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ بلند آواز میں گفتگو' قہقہے اور چائے کی پیالیوں کی کھنکناہٹ' سلیم یہ سارے لوازمات اپنے جلو میں لے کر چلتے تھے۔ آپ کمرے میں داخل ہوں تو ان کے اردگرد بہت سے اہل قلم اور اہل علم کا جمگھٹا ہوتا اور وہ درمیان میں کرسی پر دونوں پاؤں اوپر کیے بیٹھے ہوتے' سگریٹ سے سگریٹ سلگتا رہتا اور سلیم احمد علم کے موتی بکھیرتے رہتے۔

پھر ایک روز یوں ہوا یہ 1963ء کی بات ہے کہ وہ اپنے مخصوص انداز میں میرے دفتر میں میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھے تھے۔ جب وہ دونوں پاؤں اوپر رکھنے کے بجائے زمین پر رکھتے تو ایک پاؤں مستقل ہلاتے رہتے۔ اسی طرح ان کے ہونٹ بھی ہلکے ہلکے کانپتے رہتے۔ جیسے دانتوں سے آہستہ آہستہ کچھ چبا رہے ہوں۔ یہ سب ایک بے چینی اور اضطراب کا اظہار ہوتا تھا۔

سلیم احمد کے جسم میں ایک بے چین اور مضطرب روح تھی اور ایک دن جس کا میں ذکر کر رہا ہوں' یہ روح چیخ پڑی' میرے عین سامنے کرسی پر بیٹھے ہوئے سلیم احمد اپنی پوری قوت سے چلائے۔ ان کی آنکھیں لہو کی طرح سرخ ہو گئیں' ان کا سارا بدن کانپنے لگا اور وہ بلند آواز میں چیختے رہے۔ ساتھ کے کمروں سے اور کوری ڈور سے لوگ دوڑتے ہوئے میرے کمرے

میں آئے۔ سلیم احمد نے میز سے ایک پیپر ویٹ اٹھایا اور پوری طاقت سے سامنے کھڑکی پر کھینچ مارا' شیشہ چکنا چور ہونے کی آواز دور تک گئی اور ریڈیو سٹیشن پر شور مچ گیا "سلیم احمد پاگل ہو گئے ہیں۔" میں ان کے سامنے بیٹھا ایک شدید ذہنی صدمہ سے دوچار تھا۔ وہ مسلسل چلاتے رہے' ایک لفظ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں' کیا چاہتے ہیں' گفتگو مکمل طور پر بے ربط تھی اور آواز انسانی اختیار سے زیادہ بلند تھی۔ وہ شدید جلال کے عالم میں تھے۔ لوگوں نے بہ مشکل انہیں قابو کیا اور ریڈیو سٹیشن سے لے گئے۔ یہ سلیم احمد کی اس مشہور بیماری کا آغاز تھا' جس میں وہ طویل عرصے مبتلا رہے اور جس سے ان کی فکر اور شخصیت کے دیگر پہلوؤں پر اہم اثرات مرتب ہوئے۔ ان کے حلقہ یاراں میں شامل اصحاب نے ان کے رویہ اور حالت کو ابن عربی کے مطالعہ سے منسوب کیا۔ عزیز رشتہ داروں نے علاج معالجہ کے لیے ہسپتالوں اور سپیشلسٹ ڈاکٹروں کی طرف رجوع کیا اور بالآخر وہ طبی ماہرین کے مشورے پر کچھ عرصہ کے لیے کوئٹہ چلے گئے' جہاں قیام کے دوران ان کا علاج ہوتا رہا اور پھر وہ کچھ نیم صحت مند حالت میں واپس آئے۔ اب وہ ایک بدلے ہوئے سلیم احمد تھے۔ جسمانی اور ذہنی' دونوں طرح۔ میری بھی اس اندوہناک واقعہ کے بعد ان سے وہ پرانی ربط وضبط کی کیفیت نہ رہی۔ میں کچھ عرصہ بعد انگلستان ٹیلی ویژن کی تربیت کے لیے چلا گیا اور واپس آکر لاہور میں قائم ہونے والے ٹیلی ویژن سٹیشن سے منسلک ہو گیا۔

کراچی چھوڑنے کے بعد سلیم احمد سے کم کم ملاقات ہوتی رہی۔ میں نے لاہور ٹی وی سے جب سٹوڈیو تھیٹر کے زیر عنوان پروگرام میں طویل دورانئے کے ڈرامے پیش کرنا شروع کیے تو سلیم احمد کے کئی ریڈیائی ڈراموں کو مناسب ردوبدل کے بعد ٹیلی ویژن سے نشر کیا۔ ان کھیلوں میں سب سے زیادہ مقبولیت ان کے ڈرامے "ایسا کچھ کر کے چلو" کو ملی' جسے میں نے "مجرم" کے عنوان سے نشر کیا اور پہلی بار طارق عزیز نے اس کھیل میں مرکزی کردار ادا کر کے بحیثیت اداکار شہرت پائی۔ یوں سلیم احمد سے پیشہ ورانہ رشتہ کسی نہ کسی صورت میں برقرار رہا۔ انہوں نے بھی جب ریڈیو پاکستان کراچی کے جشن تمثیل کے لیے ایک نیا کھیل لکھا تو بصد اصرار مجھے لاہور سے پروڈیوس کرنے کے لیے بلوایا۔ مجھے یاد ہے اس ڈرامے کا نام "زندگی" تھا اور یہ سلیم احمد کا آخری ڈرامہ تھا' جو میں نے ریڈیو کے لیے پروڈیوس کیا۔ پھر 1970ء کے انتخابات ہوئے' ملک تقسیم ہوا اور میں پی ٹی وی کے

ہیڈکوارٹر میں ڈائریکٹر پروگرام کے عہدے پر مقرر کردیا گیا' جہاں میں تقریباً نو برس ٹیلی ویژن کے پروگراموں کے شعبے کی سربراہی کے فرائض انجام دیتا رہا۔ سلیم احمد کا قلمی تعاون اس سارے عرصے میں مجھے حاصل رہا۔ اگرچہ ان سے ملاقات خال خال ہی ہوتی' مگر افتخار عارف کی کراچی ٹیلی ویژن میں موجودگی اور ان کی پیغام رسانی کے سبب میں اور سلیم احمد ایک دوسرے سے بے خبر کبھی نہیں رہے۔

1977ء کے مارشل لا کے بعد جب وہ مختصر عرصہ کے لیے وزارت اطلاعات کے مشیر مقرر ہوئے تو ہماری تفصیلی ملاقات ہوئی۔ میں کراچی دورے پر گیا ہوا تھا کہ سلیم کا پیغام ملا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں ان سے ملنے گیا۔ یہ ان کے انچولی والے مکان میں میری پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ میں نے ازراہ مذاق ان سے کہا کہ اب تو آپ ہمارے افسر ہو' مشیر اطلاعات کا حکم ہمارے لیے وزیر اطلاعات کے حکم کے برابر ہے۔ بڑے پیار سے میرے گالوں کو تھپتھپایا اور مجھے سینے سے لگا لیا کہ آغو تم میرے لیے ہمیشہ چھوٹے بھائی کی طرح رہے۔ اس وقت بھی جب تم میرے افسر تھے اور اس وقت بھی جب میں اس وزارت کا مشیر ہوں۔ پھر بہت دیر ہم ٹیلی ویژن کے حالات' پروگراموں کی پالیسی اور مستقبل کی منصوبہ بندی پر بات کرتے رہے۔ چلتے وقت انہوں نے کہا ہمیں جلدی جلدی ملتے رہنا چاہئے۔ میں نے کہا ضرور' جب آپ چاہیں۔ مگر سلیم...... میں کہتے کہتے رک گیا۔ انہوں نے خوش دلی سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا بولو...... کیا کہنا چاہ رہے تھے۔ میں نے کہا یہ مشاورت کا عہدہ بڑے عرصہ قائم نہیں رہے گا' میں اسلام آباد میں رہتا ہوں اور وہاں کی سیاست کو قریب سے دیکھتا ہوں' یہ فیصلے جو ہو رہے ہیں' نیک نیتی اور خلوص پر مبنی نہیں ہیں۔ سلیم ہنس پڑے اور ان کے چہرے کے تاثرات سے صاف عیاں تھا کہ پھر کیا...... یہ عہدہ رہے نہ رہے' میرا اس عہدے نے کیا بنانا اور بگاڑنا ہے۔ میرا قیاس غلط نہیں تھا' کچھ عرصہ بعد جنرل ضیاء الحق نے پی این اے کے نامزد وزیروں کو کابینہ سے برطرف کردیا اور جماعت اسلامی کے وزیر اطلاعات محمود اعظم فاروقی کی وزارت کے ساتھ ہی سلیم احمد کی مشاورت بھی ختم ہو گئی' کچھ دن بعد مجھے بھی ٹیلی ویژن سے تبادلہ کرکے نیف ڈیک کا مینجنگ ڈائریکٹر بنا دیا گیا۔ ویسے سلیم احمد کے لیے مشیر ہونا کوئی باعث افتخار بات نہ تھی۔ اس عہدے نے ان کے رہن سہن پر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا۔ وہ ویسے ہی سلیم احمد رہے' جیسے مشیر ہونے

سے پہلے تھے اور بعد میں بھی ویسے ہی سلیم احمد رہے، جو مشیر ہونے کے زمانے میں تھے۔

یوں بھی زندگی سے سلیم احمد کے کچھ بہت زیادہ مطالبے نہیں تھے۔ دنیاوی نقطہ نگاہ سے ان میں وہ عیب اور وہ کمزوریاں نہیں تھیں، اگر تھیں تو بہت کم تھیں، جن کے باعث لوگ بدنام ہوتے ہیں۔ کھانا پینا، لباس، گھریلو رہن سہن غرض کسی معاملے میں بھی انؑ کی ضروریات زیادہ نہیں تھیں۔ صحیح معنوں میں درویش صفت انسان تھے، جو مل گیا وہ کھالیا، جو دیا وہ پہن لیا۔ ہاں شوق تھا تو شعروادب کا، ادبی معرکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا، مشاعروں میں شرکت کرنا، مذہبی اور فلسفیانہ مباحثوں میں شامل ہونا۔ غرض اگر یہ کہیں تو نامناسب نہ ہوگا کہ شاعری، ادب اور تنقید ہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھے۔ دن میں کسی بھی وقت اور رات میں نصف شب کے بعد تک ان کے گھر پر لوگوں کی ایک بھیڑ ہوتی، جن میں شہر کے ادیب، شاعر اور نقاد شامل ہوتے۔ کچھ ان کے ہم عمر، کچھ بزرگ اور بڑی تعداد میں نوجوان اور نئے لکھنے والے۔ سلیم احمد کو گفتگو کرنے کا بے حد شوق تھا۔ وہ بلند آواز میں بولتے اور ان کے احباب، نیاز مند اور ملاقاتی حلقہ کیے ان کے چاروں طرف بیٹھے رہتے۔ ہر شب یہی صورتحال ہوتی اور نتیجتاً سلیم احمد بہت دیر سے سوتے، دیر سے جاگتے اور دیر سے ناشتہ کرتے۔ یہ تاخیر ان کی زندگی کا معمول بن گئی تھی، جو نہ صرف اپنے گھر تک محدود تھی، بلکہ جب کبھی وہ کسی دوسرے شہر جاتے تو وہاں بھی صورتحال ایسی ہی رہتی۔ سلیم کے ایک قریبی دوست نظیر صدیقی صاحب ہیں۔ سلیم جب بھی اسلام آباد آتے، ہمیشہ ان کے گھر قیام کرتے۔ ہوٹلوں اور سرکاری مہمان خانوں میں ان کا دل نہیں لگتا تھا۔ اپنے دن بھر کے پروگرام سے فارغ ہو کر وہ گھر لوٹتے تو پھر رات گئے تک مختلف موضوعات پر بحث مباحثہ کرتے رہتے۔ نظیر صدیقی سے ان کی دوستی ایک طویل عرصہ صرف قلمی نوعیت کی رہی۔ سلیم کراچی میں تھے اور نظیر ڈھاکہ میں۔ انہوں نے سلیم احمد کی شاعری اور نثر پر بہت کچھ لکھا اور ایسا لکھا جو سلیم احمد کو پسند آیا۔ سلیم اور نظیر میں خط و کتابت کا ایک طویل سلسلہ جاری رہا اور صرف تحریروں کے ذریعے ان کے تعلقات بے تکلفی کی حدود میں داخل ہوگئے۔ رفتہ رفتہ وہ ایک دوسرے کو آپ کے بجائے تم کہہ کر مخاطب کرنے لگے۔ حتیٰ کہ جب 1969ء میں نظیر صدیقی ڈھاکہ سے ہجرت کر کے کراچی آئے اور پہلی بار سلیم احمد سے ملے تو دونوں کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ

جنم جنم سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔

سلیم احمد کے بارے میں کچھ لکھنا اور ان کی شاعری کا ذکر نہ کرنا ممکن نہیں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میں خود کو اس کا اہل نہیں سمجھتا کہ ان کی شاعری کے اسالیب' محاسن اور مقاصد پر تبصرہ کر سکوں۔ یہ کام اردو ادب کے نقادوں اور شعر و سخن سے تعلق رکھنے والے دانشوروں کا ہے اور سلیم احمد یقیناً ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہیں کہ جن پر ان کے ہم عصروں نے موافقت اور مخالفت میں بہت کچھ لکھا بھی ہے۔ میرا تعلق تو شعر و شاعری سے صرف اچھے شعروں کو پسند کرنا اور ان سے لطف اندوز ہونے تک ہے۔ رہی سلیم احمد کی شاعری تو میں نے انہیں بار ہا ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے مشاعروں میں سنا ہے۔ نجی اور ادبی محفلوں میں اپنا کلام پیش کرتے ہوئے دیکھا ہے اور ادبی رسالوں میں شائع ہونے والی ان کی تخلیقات کو ایک ایسے قاری کی حیثیت سے پڑھا ہے' جو خود بھی ان کے حلقہ احباب میں شامل رہا ہو' میں نے ان کے مجموعہ ہائے کلام کی ورق گردانی بھی کی ہے۔ جن میں بیاض' اکائی' چراغ نیم شب اور مشرق شامل ہیں۔ ایک قاری کی حیثیت سے میں صرف اتنا کہوں گا کہ وہ پاکستان کے بہت اچھے شاعروں میں سے ایک ہیں اور ان کے بہت سے اشعار دل میں اتر جانے والے ہیں۔

میرا جی چاہتا ہے کہ ان کے کچھ شعر اپنی اور اپنے پڑھنے والوں کی خاطر پیش کروں۔ لیکن اس سے پہلے سلیم احمد کے اپنے الفاظ میں ان کے پہلے مجموعہ کلام کے دیباچہ سے ایک اقتباس کہ وہ خود اپنی شاعری کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔

"شعر و ادب کے پڑھنے والے کو بالغ ہونا چاہئے اور نڈر ہونا چاہئے۔ اس مجموعہ میں شاعری کتنی ہے اور ہے بھی کہ نہیں' اس بارے میں مجھ سے زیادہ آپ کو فیصلہ کرنا ہے۔ لیکن ایک بات ضرور کہوں گا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے بڑی بے خوفی سے کہا ہے۔ میں اپنے پڑھنے والوں سے بھی اسی بے خوفی کی امید کرتا ہوں۔ میں نے شاعری نہ ہونے یا کم ہونے کی بات انکسار کے طور پر نہیں کی۔ انکسار کے معنی میری لغت میں یہ کبھی نہیں رہے کہ کسی انسان پر وحی آئے اور ابو جہل کی دل جوئی کی خاطر انکسار سے انکار کرے' جس پر وحی آئے اسے وحی کا دعویٰ کرنا چاہئے۔ انکسار کے صرف ایک معنی ہیں' اپنی حیثیت کو پہچاننا۔ آدمی کچھ لوگوں سے بڑا اور کچھ لوگوں سے چھوٹا ہوتا ہے' اسے جاننا چاہئے کہ کس سے بڑا ہے اور کس سے چھوٹا۔ پھر ان کے حسب مراتب کے مطابق ان

سے سلوک کرنا چاہئے۔ شاعری کے بارے میں ایک اور بات مجھے کہنی ہے کہ میں چاند' بادل اور دریا کے الفاظ استعمال کرنے کو شاعری نہیں سمجھتا۔ بعض لوگ' جنہیں صرف اس قسم کے الفاظ پر وجد آتا ہے' ان کا نظریہ صحیح ہو یا غلط' میں اس نظریہ کو تسلیم نہیں کرتا۔ یہ کتاب جیسی بھی ہے' میری شعوری کاوش کا نتیجہ ہے۔ ویسے بھی میں شاعری کو شعور کی اولاد سمجھتا ہوں۔"

اور اب سلیم احمد کی غزلوں سے چند ایسے شعر جو مجھے پسند ہیں اور شاید میری طرح اور بہت سوں کو بھی پسند ہوں' یہ انتخاب ان کی چالیس برسوں کی تخلیقات سے بلا کسی لحاظ کیا گیا اور اس میں ہر زمانے کے شعر شامل ہیں۔

دل حسن کو دان دے رہا ہوں
گاہک کو دکان دے رہا ہوں

شاید کوئی بندہ خدا آئے
صحرا میں اذان دے رہا ہوں

خود اپنی آگ سے تو جی اٹھے شرر کی طرح
یہ معجزہ ابھی اے کائنات باقی ہے

اس آنکھ میں خواب ناز ہو جا
اے ہجر کی شب دراز ہو جا

اے نغمہ نواز آخر شب
آہنگ شکست ساز ہو جا

کس انجمن گل کی لگن ہے کہ چمن میں
نکلتا ہی نہیں پاؤں نسیم سحری کا

اتنی کاوش بھی نہ کر اپنی اسیری کے لیے
تو کہیں میرا گرفتار نہ سمجھا جائے

اسے سنبھال کے رکھو خزاں میں لو دے گی
یہ خاک لالہ و گل ہے کہیں ٹھکانے لگے

غنیم وقت کے حملے کا مجھ کو خوف رہتا ہے
میں کاغذ کے سپاہی کاٹ کر لشکر بناتا ہوں

برا لگا مرے ساقی کو ذکر تشنہ لبی
کہ یہ سوال میری بزم میں کہاں سے اٹھا

ہر انقلاب تازہ اسی بزم سے اٹھا
نام اس کا ہوگیا یہ نصیب آسماں کے تھے

وہ چوب خشک ہوں محروم آتش سوزاں
کہ بن جلائے جسے قافلہ روانہ ہوا

دل تھا اداس عالم غربت کی شام تھی
کیا وقت تھا کہ تجھ سے ملاقات ہوگئی

سب مجھ کو جلا کے سو گئے ہیں
میں ایک چراغ نیم شب ہوں

یہ سلیم کی غزلیات کے چند منتخب اشعار تھے۔انہوں نے بہت سی نظمیں بھی لکھی ہیں

اور بہت اچھی نظمیں لکھی ہیں۔ لیکن اس خاکے میں طوالت کے خوف سے میں نظموں کے اقتباسات پیش نہیں کر رہا ہوں۔

اسی طرح سلیم کی نثر کے نمونے شامل کرنا بھی ممکن نہیں، حالانکہ انہوں نے تنقید و تحقیق کے موضوعات پر بڑی معرکتہ الآرا کتابیں تصنیف کی ہیں، جن میں نئی نظم اور پورا آدمی، غالب کون، ادبی اقدار، ادھوری جدیدیت، محمد حسن عسکری، آدمی یا انسان وغیرہ شامل ہیں۔

اس کے علاوہ مختلف النوع موضوعات پر مضامین اور اخباری کالم بھی ان کی نثری تخلیقات میں ایک گراں قدر سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ڈراموں کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ البتہ ان کی ذہنی کیفیت اور زندگی کے متعلق رویوں کا اجمالی سا اندازہ لگانے کی غرض سے میں ان کے ایک دو خطوں سے مختصر اقتباسات پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا۔ انہوں نے جن چند لوگوں کو خطوط لکھے، ان میں ساقی فاروقی، احمد جاوید، نظیر صدیقی اور چھوٹے بھائی شمیم احمد کے نام قابل ذکر ہیں۔ سب سے زیادہ مراسلے پروفیسر نظیر صدیقی کے نام ہیں، جن میں ادب کے مختلف پہلوؤں پر سلیم احمد نے اظہار خیال کیا ہے اور بحث و تمحیص کے نت نئے نکات اٹھائے ہیں۔ ان خطوط میں ذاتی تعلقات کے عکس بھی نظر آتے ہیں۔ مثلاً یہ ہے جولائی 1963ء کے ایک خط کا ابتدائی حصہ:

"نظیر بہت دنوں سے تمہیں خط نہیں لکھا، تمہیں کیا کسی کو بھی، وجہ کچھ بھی نہیں۔ بس دل نہیں چاہا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ہر چیز بے معنی معلوم ہونے لگتی ہے۔ اپنی زندگی بھی، پھر خدا کی مار کہ اس بے معنی پن میں بھی معنویت ڈھونڈنی پڑتی ہے۔ معلوم نہیں تم کیسے ہو، خفا ہو گے شاید...... دو خطوں کا جواب نہ ملنے کا برا مانا ہو گا، نہ جانے کیا سوچتے ہو گے یا شاید کچھ بھی نہ سوچا ہو۔ اور یہ سب میری خوش فہمی ہو۔ بہر حال خفا ہو تو من جاؤ، برا مانا ہو تو معاف کر دو۔ کچھ سوچا ہو تو بھول جاؤ اور کچھ نہ ہو تو مجھے خفا ہونے کی اجازت دو۔"

خط میں جس انداز سے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے، اس کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ اور اب ایک نظر ایک مشکل موضوع پر ان کے تاثرات اور خیالات۔ یہ نظیر صدیقی کو لکھے گئے اپریل 1967ء کے ایک خط کا اقتباس ہے:

”تمہارے خیالات کو جہاں تک میں سمجھا ہوں‘ ان کا خلاصہ یہ ہے کہ قدیم و جدید زمانے کے انسان میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ انسان اپنے بنیادی خصائص میں جیسا پہلے تھا‘ ویسا ہی اب بھی ہے۔ اس لیے جدید انسان اور جدید زمانے کے خلاف جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ مبنی بر حقیقت نہیں ہے اور اسی لیے نئے انسان کی بے حسی کے بارے میں میرے خیالات کو تم نے ماضی پرستی کا نتیجہ سمجھا ہے۔ میں ماضی پرستی کے الزام سے کچھ زیادہ ڈرتا نہیں ہوں۔ لیکن ماضی اور حال کی بحث میں نے نہیں چھیڑی‘ انسان پہلے کیسا تھا اور اب کیسا ہے؟ یہ میرا موضوع گفتگو نہیں ہے۔ میں نے تو ساری بحث سے ہٹ کر یہ خیال تمہارے سامنے پیش کیا کہ انسان اور انسانیت اپنے بنیادی خصائص کے ساتھ ہمیشہ موجود رہے ہیں۔ لیکن کسی خاص زمانے میں کسی ایک خصوصیت کا احساس‘ خاص شدت اختیار کر لیتا ہے۔ مثلاً نئے ادیبوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے جنس اور بھوک کو دریافت کیا۔ اس کا مطلب یہ تو کسی صورت سے نہیں ہے کہ انسان کو اس سے پہلے جنسی خواہش نہیں ہوتی تھی یا بھوک نہیں لگتی تھی۔ لیکن ان مسائل کا جو احساس اس زمانے میں پیدا ہوا ہے‘ ویسا پہلے نہیں تھا۔ بالخصوص ادب اور شعر میں اس کا اظہار اس طرح نہیں ہوا تھا۔ غم دوراں انسان کو کب نہیں رہا‘ مگر غم دوراں کو جو اہمیت ہمارے دور میں ملی‘ وہ کبھی نہیں ملی تھی۔ ادبی تخلیقات خواہ وہ تحریکوں کی صورت میں ہوں یا انفرادی کوشش اور کاوش کا نتیجہ ہوں۔ بعض ایسے نفسیات سے پیدا ہوتی ہیں‘ جنہیں کوئی ایک نسل یا فرد اپنے اندر دریافت کرتی ہے اور اس کے بعد انہیں کسی کلیہ کی شکل دے دیتی ہے۔“

اور یہ ہے ان کے ایک اور خط سے اقتباس‘ جس میں انہوں نے ادیب اور ادب کے سلسلے میں اپنا منشور بیان کیا ہے:

”ہم اپنی زندگی اور حالات کے خالق نہیں ہیں۔ جیسے حالات اور جیسی زندگی ہمیں دی گئی ہے‘ چاروناچار اسی کو بسر کرنے پر مجبور ہیں اور اب بسر کرنے میں بھی کتنی دیر باقی ہے۔ بہت گزر گئی‘ تھوڑی رہ گئی ہے‘ ہنس کر اسے گزار کہ رو کر گزار دے۔ ایک بات البتہ کہتا ہوں ذرا سوچو کہ اگر ادیب نہ ہوتے یہ زندگی کچھ آسان نہ ہوتی؟

دیکھو کتنے ادیب ہیں کہ لکھ پتی بن گئے‘ ادب نے انہیں روکا نہیں۔ سوال یہ ہے کہ معاشرے کو اپنی شرط پر قبول کرنا چاہتے ہو یا معاشرے کو اس کی شرائط پر ماننے کو تیار

ہو؟ معاشرہ تمہیں سب کچھ دینے کو تیار ہے اور دے سکتا ہے' مگر اس کے لیے تمہیں اس کے شرائط نامے پر دستخط کرنا ہوں گے۔ ادب کو میں نے کبھی صرف لکھنا لکھانا نہیں سمجھا۔ ادب ایک طرز حیات ہے اور اپنی تکمیل کے لیے صوفیوں جیسی ریاضتوں اور مجاہدوں کا طالب ہے۔ زندگی میں کامیابی کا راستہ ادب کا راستہ نہیں ہے۔ یہ دو مختلف منزلیں ہیں اور دونوں راستے جدا جدا ہیں اور دونوں کے درمیان انتخاب کا مسئلہ ہے بہت سے لوگوں نے ادب کو طرز حیات بنانے کے بجائے کاروبار بنایا اور اس میں کامیاب ہوئے۔"

سلیم احمد نے ادب کو کاروبار نہیں بنایا' حالانکہ ان کی روزی کا ذریعہ تا حیات ان کا قلم ہی رہا۔ انہوں نے زندگی بھر سرکار کی نوکری کی۔ سرکاری اداروں کے لیے سرکاری پالیسیوں کے مطابق لکھا۔ مگر اوپر بیان کیے ہوئے اپنے منشور سے کبھی بے ایمانی نہیں کی۔ انہوں نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لیے بھی جو کچھ لکھا' وہ اپنے فلسفہ حیات اور اپنے مؤقف سے متضاد نہیں تھا اور پھر جہاں بھی بحثیت ایک شاعر اور نثر نگار ان کو اپنے خیالات کے اظہار کا موقع ملا' وہاں انہوں نے ہمیشہ آزادانہ انداز میں کھل کر اپنے دل کی بات کی۔ ان کا یہی رویہ اور طرز حیات ان کی شہرت اور عزت کا باعث ہے۔ سلیم احمد نے ادب کی دنیا میں دوست اور ہمنوا بھی پیدا کیے اور مخالفین بھی۔ مگر دوست دشمن نے ہمیشہ ان کی جرأت اور بے باکی کا یکساں اعتراف کیا۔ انہوں نے جو کچھ لکھا اور کہا بانگ دہل کہا اور اپنے کہے سے نہ کبھی پیچھے ہٹے نہ کسی شرمندگی اور معذرت کا رویہ اپنایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا نام' ان کی شخصیت' ان کا کردار ادب کے حلقوں میں جیسا ان کی زندگی میں سمجھا جاتا' ویسا ہی اس دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد سمجھا جاتا رہا۔

اسلم فرخی' سلیم احمد کے ایک قریبی دوست ہیں' جنہوں نے کم و بیش 35 برس سلیم کے ساتھ بسر کیے۔ سلیم احمد پر اپنے خاکے میں انہوں نے لکھا کہ: "میں نے سلیم کو کسی سے مرعوب ہوتے نہیں دیکھا۔ نہ وہ خود کسی کو مرعوب کرتا تھا' اس کی شخصیت من موہنی تھی' لوگ خود بخود کھنچتے تھے۔ 48ء سے 83ء تک سلیم سے تعلقات رہے' مگر میں نے اس کی زبان سے کوئی ناشائستہ بات' بے ہودہ جملہ یا کسی کی برائی نہیں سنی۔ میری معلومات کے مطابق وہ ایک شفیق باپ' محبت کرنے والا بھائی اور خدمت گزار بیٹا تھا۔ اس

نے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں کسی کا سہارا نہیں لیا' کسی کی امداد نہیں چاہی' چونکہ وہ خود حالات کی بھٹی میں پگھل کر کندن ہوا تھا۔ اس لیے نوجوانوں کے ساتھ اس کا رویہ بڑا ہمدردانہ تھا۔ وقفے وقفے سے اعصابی دباؤ کا شکار رہنے کے باوجود ہمیشہ خوش مزاج نظر آیا۔"

میرے لیے سلیم احمد کی وفات بالکل اچانک تھی۔ مرنے سے کافی عرصہ پہلے سے میری اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی' مگر ادبی رسالوں' اخباری کالموں' ریڈیو اور ٹی وی کے مشاعروں کے ذریعے یک طرفہ رابطہ ہمیشہ قائم رہا۔ اس تمام عرصہ میں مجھے کبھی یہ خیال نہ آیا کہ سلیم احمد مر بھی سکتا ہے۔ اس روز میں لاہور میں ایک میٹنگ کی صدارت کر رہا تھا' جس میں پاکستان کے پہلے قومی فلمی ایوارڈز کی تفصیلات طے کی جانا تھیں کہ کسی نے آکر کہا ریڈیو پاکستان لاہور کا کوئی پروڈیوسر مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ میں نے کہا ان سے کہو دوپہر کے بعد آئیں' ابھی میں ایک میٹنگ میں ہوں' مگر پروڈیوسر کا اصرار تھا کہ کام بہت اہم ہے۔ صرف چند منٹوں کے لیے ان کا مجھ سے ملنا ضروری ہے۔ میں نے میٹنگ کے شرکاء سے معذرت کر کے ان کو اندر بلوا لیا۔ ریڈیو پروڈیوسر ایک چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر لیے آئے اور اسے میز پر رکھتے ہوئے بولے: "سر! آپ کے تاثرات ریکارڈ کرنا ہیں۔ ہم شام کو سلیم احمد پر ایک پروگرام نشر کر رہے ہیں۔" "سلیم احمد پر...... مگر کیوں؟" میں نے دریافت کیا۔ اب ان کو احساس ہوا۔ وہ ایک دم سٹپٹا گئے اور گردن جھکا کر بولے: "سر...... آپ کو شاید علم نہیں ہے' رات سلیم احمد کراچی میں انتقال کر گئے۔" مجھ پر جیسے بجلی سی گر پڑی۔ دل و دماغ ماؤف ہو کر رہ گئے۔ اس وقت تاثرات تو کیا ریکارڈ کراتا' میری روتے روتے ہچکی بندھ گئی' میٹنگ ختم کر دی گئی اور فلم پروڈیوسرز ایسوسی ایشن کے اراکین نے کہ جو اس میٹنگ میں شریک تھے' فلم سٹوڈیوز سلیم احمد کے سوگ میں بند کرنے کا اعلان کیا۔

سب چلے گئے اور میں تادیر کرسی پر اکیلا بیٹھا رہا۔ یادوں کے آسمان پر سلیم احمد کے ساتھ بیتے ہوئے دن روشن اور چمکدار ستاروں کی طرح ابھرتے اور ڈوبتے رہے۔ میرے لیے یہ ایک بہت بڑے شاعر اور ادیب کی موت تھی۔ ایک پیشہ ور ساتھی کی موت تھی' جس کے لکھے ہوئے بہت سے ڈرامے میں نے پروڈیوس کیے۔

ایک نیک دل اور عالی ظرف انسان کی موت تھی۔ ایک اچھے دوست کی موت تھی۔ اور سب سے بڑھ کر ایک بھائی کی موت تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ اس رات سلیم احمد بالکل اچھے بھلے سوئے تھے' مگر صبح کو جب ان کی بیٹی انہیں بیدار کرنے ان کے کمرے میں گئی تو ان کی نیند ابدی نیند میں بدل چکی تھی۔ جانے کس وقت رات کی خاموشی اور تاریکی میں وہ چپ چاپ اس دنیا سے چلے گئے' نہ کسی سے کچھ کہا' نہ سنا۔ فیض صاحب نے اسی طرح کی موت کے لیے کہا تھا:

تھک کر یونہی دم بھر کے لیے آنکھ لگی تھی
سو کر ہی نہ اٹھیں یہ ارادہ تو نہیں تھا